10 دسمبر 1948ء ۔اقوام متحدہ کی تاریخ کا اہم دن

آزادی ضمیر و مذہب کے حوالہ سے پاکستان اور حضرت چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحب کی خدمات

مکرم ڈاکٹر مرزا سلطان احمد صاحب

10 دسمبر 1948ء دنیا اور اقوام متحدہ کی تاریخ میں ایک اہم دن ہے۔اس روز اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے 'انسانی حقوق کے عالمی منشور' (United Nations Universal Declaration of Human Rights) کی منظوری دی۔ایک عرصہ سے ایک کمیٹی اس کی تیاری کر رہی تھی اور تیاری کے طویل مراحل کے بعد اسے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں بحث اور منظوری کیلئے پیش کیا گیا۔اس کی اکثر شقوں کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں تھا کیونکہ ان شقوں میں مختلف زاویوں سے بنیادی انسانی حقوق کو محفوظ کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔لیکن بعض شقوں کے کچھ حصہ متنازعہ بھی تھے۔ان میں سے ایک متنازعہ دفعہ اس منشور کی تیسری دفعہ تھی۔جو مسودہ جنرل اسمبلی میں پیش کیا گیا اس کے الفاظ یہ تھے۔

The rights set forth in this Declaration apply equally to all inhabitants of Trust and non-self - governing territories.

اس اعلان میں جو حقوق درج کئے گئے ہیں، ان کا اطلاق ان علاقوں کے مکینوں پر بھی ہوگا جو کہ ٹرسٹ کے تحت چلائے جا رہے ہیں یا اور جنہیں اپنی حکومت چلانے کا اختیار نہیں ہے۔

اس شق کا پس منظر یہ تھا کہ اس دور میں بہت سے ممالک کو آزادی حاصل نہیں تھی اور وہ یورپی طاقتوں کے محکوم کی حیثیت رکھتے تھے۔اور ان میں بہت سے مسلمان ممالک بھی شامل تھے۔بہت سے ممالک اس وقت برطانیہ کے محکوم تھے اور ان کے لوگوں کو اپنی حکومت خود چلانے کا اختیار نہیں تھا۔ان میں یہ ممالک شامل تھے

Antigua and Barbuda، بہاماز، بحرین، بادبادوس بوٹسوانہ، برونائی، سائپرس، ڈومینیکا، سشیلز، فجی، غانا، گیمبیا، گرینیڈا، طوالو گیانا، جمیکا، کینیا، کویت، لیسوتھو، ملاوی، ملائشیا، مالدیو، مالٹا، ماریشس، نائیجیریا، قطر، سیرالیون، سوڈان، سوازی لینڈ، تنزانیہ، یوگینڈا، عرب امارات، زیمبیا، زمبابوے۔اس کے علاوہ لیبیا، مراکش، تیونس، کیمرون سینیگال، ٹوگو، مالی، مڈغاسکر، کونگو، صومالیہ، نائیجر، برکینا فاسو، چاڈ، آئیوری کوسٹ، گیبن، ماریطانیہ، برونڈی، روانڈا، گنی بساؤ، موزمبیق، انگولا اور جبوتی بھی فرانس اور دوسری یورپی طاقتوں کے محکوم تھے۔

یہ فہرست ظاہر کرتی ہے کہ دنیا کے کئی ممالک اس وقت آزاد نہیں تھے اور ان محکوم ممالک میں بہت سے مسلمان ممالک بھی شامل تھے۔اگر اقوام متحدہ کی سطح پر انسانی حقوق کی اور ان حقوق کو محفوظ کرنے کی بات ہو رہی تھی تو ان محکوم ممالک اور محکوم اقوام کی بات بھی ہونی چاہئے تھی کہ ان کو بھی آزادی ملنی چاہئے۔ورنہ پہلی اور دوسری شقوں میں یہ ذکر ہو کہ تمام انسان برابر ہیں اور آزاد ہیں اور تیسری شق میں ان ممالک کا ذکر ہو کہ انہیں تو ابھی آزادی بھی نہیں ملی اور ان کی آزادی کی اس منشور میں کوئی بات نہ کی جائے تو یہ ایک بے معنی بات ہوگی۔اگر انسانی حقوق کی بات ہو رہی تھی تو ان محکوم ممالک کی آزادی کی بات بھی ہونی چاہئے تھی۔جب یہ مسودہ منظوری کیلئے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں پیش ہوا تو سوویت یونین کی طرف سے اس مسودہ میں چار ترامیم پیش کی گئیں۔اس منشور کی تیسری دفعہ کے الفاظ بدل کر مندرجہ ذیل عبارت کی تجویز پیش کی گئی۔

"1. Every people and every nation has the right to national self-determination. States responsible for the administration of non-self-governing territories, including colonies, shall facilitate the implementation of this right, guided by the principles and purposes of the United Nations in regard to the people of such territories.

"2. Every people and every nationality within a State shall enjoy equal rights. State laws shall not permit any discrimination what so ever in this regard. National minorities shall be guarented the right to use their native language, and to possess their own national schools, libraries, museums and other cultural and educational institutions.

"3. The human and civic rights and fundamental freedoms set forth in the present Declaration shall be extended to the population of non-self governing territories including colonies."

ترجمہ: 1۔تمام لوگوں اور تمام اقوام کو قومی طور پر حق خود اختیاری حاصل ہے۔وہ حکومتیں جو کہ ایسے علاقوں کا انتظام کر رہی ہیں جن کے لوگوں کو اپنے علاقوں پر حکومت کا اختیار نہیں ہے، اقوام متحدہ کے اصولوں اور مقاصد سے راہنمائی حاصل کرتے ہوئے ان علاقوں کے لوگوں کو یہ حق دلانے کے لئے سہولت مہیا کریں گی۔

2۔ایک ریاست کے اندر بسنے والے تمام لوگوں اور تمام اقوام کو برابر کے حقوق حاصل ہوں گے۔ ریاست کے قوانین اس معاملے میں کسی امتیاز کی اجازت نہیں دیں گے۔اقلیتی اقوام کو اپنی مقامی زبان استعمال کرنے، اور اپنے قومی سکول، لائبریریاں، عجائب گھر اور دیگر ثقافتی اور تعلیمی ادارے چلانے کی آزادی کی ضمانت دی جائے گی۔

3۔ان انسانی اور شہری حقوق اور بنیادی آزادیوں کا اطلاق، جن کی ضمانت اس اعلان میں دی گئی ہے، ان علاقوں پر بھی ہوگا جنہیں خود اپنے علاقوں پر حکومت کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہے اور ان میں نوآبادیاں بھی شامل ہیں۔

اس تجویز کردہ ترمیم کی عبارت ہی اس بات کو واضح کر دیتی ہے کہ اس میں محکوم ممالک اور اقوام کی آزادی کو تیز تر بنانے کی مؤثر تجویز دی گئی تھی۔اس وقت دنیا کا ایک بڑا حصہ کسی نہ کسی یورپی ملک مثلاً برطانیہ، فرانس، پرتگال وغیرہ کا محکوم تھا۔اور ان کی آبادیوں کو اپنے ملک پر خود حکومت کرنے کا اختیار حاصل نہیں تھا۔اور بہت سے مسلمان ممالک بھی اس فہرست میں شامل تھے۔لیکن یورپی طاقتیں اور ان کے گروہ کے ممالک اس ترمیم کی مخالفت کر رہے تھے کیونکہ یہ تجویز ان کے مفادات کے خلاف تھی۔اور ان کے رعب کی وجہ سے باقی ممالک بھی اس تجویز کی حمایت نہیں کر رہے تھے۔اگر یہ ترمیم منظور کر لی جاتی تو ان مسلمان ممالک کا بھی فائدہ ہونا تھا اور ایشیا اور افریقہ کے کئی اور ممالک کا بھی فائدہ ہونا تھا۔بہرحال 10 دسمبر 1948ء کو جب اس ترمیم پر رائے شماری ہوئی تو اس کے حق میں صرف آٹھ اور اس کے خلاف چونتیس ووٹ آئے۔14 ممالک غیر جانبدار رہے۔اس تجویز کی حمایت میں سوویت یونین، یوکرین، یوگوسلاویا، بیلوروس، چیکوسلاویا، پولینڈ اور کولمبیا نے ووٹ دیئے۔پاکستان کی نمائندگی کرتے ہوئے حضرت چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحب نے اس تجویز کے حق میں ووٹ دیا۔یہ امر قابل ذکر ہے کہ پاکستان کے علاوہ نہ کسی مسلمان ملک نے اس تجویز کے حق میں ووٹ دیا اور نہ ایشیا یا افریقہ کے کسی اور ملک نے اس کے حق میں ووٹ دیا۔یہ اعزاز پاکستان کو ہی حاصل ہے کہ اس وقت جب تمام ممالک بڑی طاقتوں کے دباؤ میں آگئے تھے اس وقت پاکستان نے دنیا کے محکوم ممالک کی آزادی کی تجویز کے حق میں ووٹ دیا تھا۔جن ممالک نے اس تجویز کے خلاف ووٹ دیا تھا ان میں امریکہ برطانیہ، آسٹریلیا، بھارت، ایران، میکسیکو، نیوزی لینڈ، فرانس، شام اور ترکی بھی شامل تھے۔

اس کے علاوہ ایک اور مرحلہ پر اس منشور کی تیاری میں قدرے اختلاف پیدا ہوا اور یہ اختلاف مذہبی آزادی کی دفعہ پر تھا۔انسانی حقوق کے منشور کی دفعہ 18 یہ ہے

''ہر انسان کو آزادی فکر۔ آزادی ضمیر اور آزادی مذہب کا پورا حق ہے۔اس حق میں مذہب یا عقیدے کو تبدیل کرنے اور پبلک میں یا نجی طور پر، تنہا یا دوسروں کے ساتھ مل جل کر عقیدے کی تبلیغ، عمل، عبادات اور مذہبی رسمیں پوری کرنے کی آزادی بھی شامل ہے۔'' جب اس دفعہ پر بحث شروع ہوئی تو سعودی عرب کے نمائندے نے اس دفعہ کی مخالفت کی اور بعض دوسرے ممالک کو بھی اس دفعہ پر تحفظات تھے۔پاکستان کا مؤقف بیان کرتے ہوئے حضرت محمد چوہدری ظفر اللہ خان صاحب نے یہ وضاحت پیش کی کہ قرآن کریم مکمل مذہبی آزادی کی ضمانت دیتا ہے اور اس ضمن میں یہ آیت کریمہ پیش کی'' اور کہہ دے حق وہی ہے جو تمہارے رب کی طرف سے ہو۔پس جو چاہے وہ ایمان لے آئے اور جو چاہے سو انکار کر دے۔'' (الکہف 30) اب تک اس موضوع پر جو تحقیق سامنے آ رہی ہے اس میں یہ اعتراف کیا گیا ہے کہ اس دفعہ کو منظور کرانے کیلئے حضرت چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحب نے کلیدی کردار ادا کیا تھا۔

(HUMAN RIGHTS IN ISLAM by ROBERT TRAER, Islamic Studies vol. 28, No. 2 (Summer 1989), pp. 117-129)

(The Ashgate Research Companion to Islamic Law, edited by Peri Bearman, Professor Rudolph Peter، Published by Ashgate publication Ltd. P 283)

جنرل اسمبلی میں اس بحث کے دوران مصر کے نمائندے نے مذہبی آزادی کے حوالے سے تبدیلی مذہب کے بارے میں منفی رائے کا اظہار کیا تھا اور اس بارے میں انہوں نے اپنی رائے کی بنیاد کسی قرآنی آیت کو نہیں بنایا تھا بلکہ اپنے اس خیال کو بنایا تھا کہ جب بھی کوئی مذہب تبدیل کرتا ہے تو اکثر اوقات ایسا قدم نامناسب خارجی اثرات کی وجہ سے اُٹھایا جاتا ہے۔یہ ایک بہت پھسپھسی دلیل تھی۔یہ ہر حکومت کا کام ہے کہ اس بات کو یقینی بنائے کہ ہر شخص کو ہر طرح ضمیر اور رائے کی آزادی حاصل ہو۔اگر یہ آزادی حاصل ہوگی تو کون سے نامناسب خارجی عوامل تبدیلی مذہب پر مجبور کر سکیں گے اور پھر تو یہ دلیل بھی پیش کی جا سکتی ہے کہ خارجی عوامل بعض انسانوں کے سیاسی خیالات پر بھی نظر انداز ہو سکتے ہیں۔اور اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ اس کلیہ کی رو سے سیاسی خیالات کی آزادی بھی حاصل نہیں ہونی چاہئے اور اگر تبدیلی مذہب کی

اجازت نہیں ہونی چاہئے تو پھر اس نظریہ کی رو سے گزشتہ چودہ سو سال میں بے شمار ملکوں میں کروڑوں لوگوں نے اسلام قبول کیا ہے بلکہ اب تک اسلام قبول کر رہے ہیں، ان پر بھی یہ الزام آئے گا کہ انہوں نے نامناسب خارجی عوامل کی بناء پر اپنا سابقہ مذہب ترک کر کے اسلام قبول کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس منطق کو عقل قبول نہیں کر سکتی۔

(کارروائی جنرل اسمبلی، 10 دسمبر 1948ء ص 1891,1889-913,912)

اس موقع پر اور اس منشور کی تیاری کے مراحل کے موقع پر جو بحث ہوئی اور چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحب نے جو مؤقف اختیار کیا، اس کا ذکر علمی حلقوں میں اب تک کیا جاتا ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس منشور کی منظوری کے موقع پر سعودی عرب نے اس کے حق میں ووٹ نہیں دیا تھا۔ بلکہ غیر جانبدار رہا تھا۔ ایک اور مسلمان مندوب محمد حبیب صاحب بھی موجود تھے جو کہ ہندوستانی وفد میں شامل تھے انہوں نے اس بات کا اظہار کیا کہ اگر سعودی تجویز کو مان لیا گیا تو یہ ایک سانحہ ہو گا۔ اس موقع پر پاکستانی وفد نے جس کی قیادت حضرت چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحب کر رہے تھے کہ یہ مؤقف پیش کیا ان کا وفد تبدیلی مذہب کے حق کو محفوظ کرنے کی حمایت اسلام کی عزت کی حفاظت کے لئے کر رہا ہے۔ اس حوالے سے اب بھی یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحب نے اس مؤقف کے حق میں اتنے واضح طریق پر دلیری کے ساتھ جو آواز اُٹھائی تھی اس کی کیا وجہ ہے۔ اور اس کی دو وجوہات بیان کی جاتی ہیں۔ ایک وجہ تو یہ کہ چوہدری صاحب پر احمدیت کا اثر ہے اور دوسری وجہ یہ بیان کی تھی کہ ان کے خیالات پر بانی پاکستان محمد علی جناح سے متاثر تھے۔

(Universal Human Rights: The contribution of Muslim states, by Susan Waltz, Human Rights Quarterly Vol. 26 p 813-819)

❁❁❁❁❁❁❁

مکرم مولانا عبدالباسط شاہد صاحب

جامعہ احمدیہ کا قادیان سے ربوہ تک سفر

حضرت مصلح موعود کے وقف زندگی کے متعلق ارشادات اور پیارے بزرگ والدین کی حوصلہ افزائی سے خاکسار کو زندگی وقف کرنے کی توفیق ملی اور مدرسہ احمدیہ میں داخلہ کی سعادت حاصل ہوئی۔ 1947ء میں خاکسار نے مدرسہ احمدیہ میں داخلہ لیا اور اسی سال تقسیم ملک کا سانحہ پیش آ گیا۔ موسمی رخصتوں کے بعد جب مدرسہ کھلنے کا وقت آیا تو ہم پاکستان پہنچ چکے تھے۔ مدرسہ احمدیہ میں پہلی کلاس میں 61 طالب علم تھے۔ جب ہم چنیوٹ پہنچے اور منتشر پرندے پھر جمع ہونا شروع ہوئے تو ہم صرف 17 رہ گئے تھے۔ باقی حالات کے تھپیڑوں سے نہ جانے کہاں کہاں چلے گئے۔ حضرت مصلح موعود نے بے سروسامانی کے عالم میں اپنی خداداد اولوالعزمی سے کام لیتے ہوئے جامعہ احمدیہ شروع کرنے کا ارادہ فرمایا۔ سنت نگر کی ایک متروکہ عمارت میں یہ ادارہ اس حال میں شروع کیا گیا کہ فرنیچر کے نام پر وہاں ایک خستہ چٹائی اور ایک کرسی موجود تھی۔ ہمارے اساتذہ میں سے کچھ تو ابھی قادیان میں ہی تھے اور کچھ پاکستان میں آ گئے تھے۔ اس وقت اساتذہ میں سے ہمارے بزرگ حضرت حافظ مبارک احمد صاحب ہی موجود تھے اور سب کلاسوں کو ملا کر تھوڑے سے طالب علم تھے جو چٹائی پر بیٹھ کر حضرت حافظ صاحب کے تجربات سے استفادہ کی کوشش کرتے تھے۔

جامعہ احمدیہ نے لاہور سے چنیوٹ کا سفر اختیار کیا اس عارضی انتظام کے بعد احمد نگر میں مستقل انتظام اس شان سے ہوا کہ جو عمارت جامعہ کو ملی تھی وہ اصطبل کے نام سے مشہور تھی اور وہاں رہائش شروع کرتے وقت اصطبل کے لازمی نشانات و اثرات گوبر وغیرہ کئی جگہ موجود تھے اس کی صفائی وغیرہ کر کے یہ سمجھنے کی کوشش کرتے رہے کہ یہ انسانی رہائش گاہ ہے۔ ایک لمبے برآمدے میں چھوٹی چھوٹی دیواریں کھڑی کر کے کلاس روم بنا لئے گئے۔ کچے فرش کو لپائی وغیرہ کر کے اسی فرش پر بستر لگا کر ہوسٹل کے مزے لوٹے گئے۔

کلاس روم کا ذکر ہو چکا ہے اس کی مناسبت سے ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ ان حالات میں طالب علموں نے ایک شرارت ایجاد کی چپکے چپکے نظر بچا کر ایک کلاس سے دوسری کلاس میں کنکر یا کاغذ کے گیند بنا کر پھینک دئے جاتے کچھ دیر شکایت اور جواب طلبی کا سلسلہ چلتا اور پھر پڑھائی شروع ہو جاتی۔ ایک دفعہ ہمارے ایک کلاس فیلو نے (بعد میں وہ یورپ کے ایک ملک میں مربی انچارج کی حیثیت میں مفید خدمات بجا لاتے رہے اور اب اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو چکے ہیں) شرارت سے ایک کنکر اپنی انگلیوں میں پھنسا کر دوسری کلاس کی طرف اچھال دیا وہاں شور شروع ہو گیا۔ اس وقت ہمیں مولانا ابوالحسن قدسی صاحب پڑھا رہے تھے۔ مولانا بہت توجہ سے پڑھاتے تھے۔ اپنے مضمون پر مکمل عبور رکھتے تھے۔ بہت کم گو تھے اور نرم خو بھی۔ اتفاق سے ان کی نظر پڑ گئی اور انہوں نے طالب علم کو شرارت کرتے ہوئے دیکھ لیا۔ جبکہ اس طالب علم نے یہ سمجھا تھا کہ میں نے بڑی ہوشیاری سے کام لیا ہے اور کسی کو پتہ نہیں چلنے دیا کہ یہ کس کا کام ہے۔ محترم قدسی صاحب نے اسے آگے بلایا، کلاس چٹائی پر بیٹھی تھی اور اسی چٹائی کے ایک کونے میں ہی استاد محترم بھی تشریف فرما تھے۔ وہ طالب علم بہت عمدگی سے آلتی پالتی مار کر ان کے سامنے بیٹھ گئے۔ محترم قدسی صاحب جو بہت کم غصہ میں آتے تھے فرمانے لگے ”اس کو دیکھو یہ دیکھنے میں کتنا مرحوم و مغفور لگتا ہے اور میں نے اس کو خود شرارت کرتے ہوئے دیکھا ہے“۔

احمد نگر میں شروع شروع میں تو گاؤں کے ماحول کی وجہ سے کھانے پینے کی اشیاء کی افراط تھی۔ اس سے اندازہ کیجئے کہ ہم وہاں معمولی قیمت پر مکھن خریدتے تھے اور اس کے ساتھ ایک دو گلاس لسی بھی مل جایا کرتی تھی مگر آہستہ آہستہ یہ نوبت بھی آ گئی کہ پہلے گندم کی کمی شروع ہوئی۔ دو روٹی کی بجائے ایک روٹی ملنے لگی اور پھر یہ وقت بھی آیا کہ مجبوراً چاولوں کی طرف جانا پڑا۔ باسمتی چاول سے موٹے چاول کی نوبت آئی اور پھر وہ بھی نایاب ہو گئے۔ گندم اور چاولوں کے حصول کے لئے ہر ممکن کوشش تو کی جاتی تھی مگر ایک وقت ایسا بھی آ گیا کہ ہوسٹل میں ابلی ہوئی گاجروں میں گڑ ڈال کر ”گاجر کا حلوہ“ کھانے کی عیاشی کروائی جاتی تھی۔ اس سیاہی رنگ ملغوبہ کو دیکھ کر کھانے سے پہلے ہی ”سیری“ ہو جاتی تھی۔ کھانے کے ذکر کے ساتھ اگر وہاں ملنے والی چائے کا بھی ذکر ہو جائے تو اس کا بھی مزہ آ جائے گا۔ چائے بنانے کے لئے ہمارا نسخہ یا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ پہلے دو آنے جمع کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ دو تین طالب علم یہ رقم جمع کرتے اس میں سے ایک آنے کا دودھ، دو پیسے کی چائے کی پتی اور دو پیسے کا گڑ لیا جاتا تھا۔ یہ مرحلہ طے ہو جاتا تو چائے پکانے کا مرحلہ آ جاتا اس میں ایک طریق تو بہت ہی آسان تھا۔ ٹین کے ایک ڈبہ میں پتی دودھ پانی وغیرہ ڈال کر تنور میں رکھ دیا جاتا۔ چائے فوراً تیار ہو جاتی۔ دوسرا طریق خاصا صبر آزما تھا۔ ہم میں سے اکثر طالب علموں کے پاس مٹی کے تیل کا دیا ہوتا تھا۔ اس روشنی میں پڑھتے ہوئے اکثر ناک کے نتھنوں کی سیاہی سے اندازہ ہوتا تھا کہ کتنی دیر پڑھائی کی گئی ہے۔ کچھ طالب علموں کے پاس شیشہ کا لیمپ ہوتا تھا انہوں نے سٹینڈ بنوائے ہوئے تھے جو لیمپ پر رکھ کر اس پر چائے کی کیتلی رکھ دی جاتی تھی اور آہستہ آہستہ اس میں کچھ ایسی تبدیلی آ جاتی تھی جسے چائے کا نام دیا جا سکتا تھا۔ اس کا یہ فائدہ ضرور تھا کہ پڑھائی کے لئے زیادہ وقت مل جاتا تھا۔ جامعہ احمدیہ سے فارغ ہونے اور مولوی فاضل کرنے کے بعد جامعۃ المبشرین ربوہ میں داخلہ کا وقت آیا۔ حسن اتفاق سے اسی سال خالد احمدیت حضرت مولانا ابوالعطاء صاحب جامعۃ المبشرین کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ اس طرح حضرت مولوی صاحب کے ساتھ ساتھ ہم احمد نگر سے ربوہ آ گئے۔ ربوہ میں ہمیں جلسہ سالانہ کے لنگر خانہ والی کچی عمارت میسر آئی۔ سارے صحن میں تنور تھے اور ان کی وجہ سے کئی حادثے اور لطیفے جنم لیتے رہتے تھے۔ بارش میں اکثر چھتیں ٹپک رہی ہوتی تھیں اور کتابوں کپڑوں کو محفوظ کرنے کے لئے خاصی کوشش کرنی پڑتی تھی اور بعض دفعہ تو صحن میں پڑی پانی کی ٹینکیوں سے مدد لینی پڑتی تھی۔

مذکورہ حالات و مشکلات کے باوجود ہمارے بزرگ اساتذہ جذبہ وقف سے سرشار ہماری تعلیم و تربیت میں پوری توجہ اور دلجمعی سے ماں باپ کی سی محبت و شفقت سے مصروف رہتے اور طالب علم بھی خدمت دین کی سعادت حاصل کرنے کی امیدیں پوری بشاشت سے اپنے مقصد کے حصول کے لئے کوشاں رہتے۔ خاکسار نے مدرسہ احمدیہ۔ جامعہ احمدیہ اور جامعۃ المبشرین کا ذکر کیا ہے اس سلسلہ میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس زمانے میں ابتدائی تعلیم مدرسہ احمدیہ میں ہوتی تھی۔ چار سال کے بعد وہاں سے فراغت ہوتی تو جامعہ احمدیہ میں داخلہ ملتا تھا۔ ربوہ میں حضرت مصلح موعود کی ہدایات و رہنمائی میں جامعہ احمدیہ کے فارغ التحصیل طلبہ کے لئے جامعۃ المبشرین کے نام سے ایک ادارہ بنایا گیا۔ آج کل یہ تینوں ادارے جامعہ احمدیہ میں ضم ہو گئے ہیں اور یہ ادارہ قادیان اور ربوہ کی حدود سے نکل کر دنیا بھر میں پھیل چکا ہے اور جماعتی، تربیتی، تعلیمی اور دعوت الی اللہ کی ضروریات کو باحسن پورا کر رہا ہے۔

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دعا کی غرض سے اپنے بعض اساتذہ کرام کا بھی یہاں ذکر ہو جائے۔ خالد احمدیت کامیاب مربی و معلم۔ زبان و قلم کے دھنی حضرت مولانا ابوالعطاء صاحب ہمارے پرنسپل تھے۔ ایک بہت ہی کامیاب مناظر اور منطق و فقہ کے ماہر حضرت قاضی محمد نذیر صاحب۔ عربی ادب اور اردو شاعری کے باکمال عالم مولانا ظفر محمد صاحب ظفر۔ میدان دعوت الی اللہ و مناظرہ کے شہسوار مولانا قریشی محمد نذیر صاحب۔ ایک نڈر مجاہد اور صبر و برداشت کا نشان مولانا ظہور حسین صاحب۔ علم نحو و صرف کے ماہر مولانا عطاء الرحمان صاحب طالب۔ منقولی علوم کے ماہر مولانا شہزادہ خان صاحب۔ منطق و فلسفہ اور تمام دینی علوم میں کمال رکھنے والے، بہت سادہ طبع مولانا ارجمند خان صاحب جامعہ احمدیہ میں اور پھر جامعۃ المبشرین میں علم فقہ کے ماہر مولانا ملک سیف الرحمان صاحب۔ حدیث کے ماہر مولانا محمد احمد صاحب جلیل۔ علم کلام و حدیث کے ماہر مولانا غلام باری صاحب سیف۔ علم فقہ میں ید طولیٰ رکھنے والے مولانا محمد احمد صاحب ثاقب۔ علم تفسیر اور انتظامی امور کے ماہر مولانا ابوالمنیر نور الحق صاحب۔ ماہر طب مولانا حکیم محمد اسمٰعیل صاحب۔ آسمان احمدیت کے درخشندہ ستارے ہمارے سر پر سایہ فگن رہے۔ طالب علموں نے اپنے اپنے ظرف اور کوشش کے مطابق ان سے استفادہ کیا۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو غریق رحمت فرمائے۔

☆☆☆☆☆☆☆

مرسلہ: مکرم مرزا مبارک احمد صاحب

شذرات ۔ ملکی اخبارات سے مفید حوالہ جات

اپنے براہیم کی تلاش

عالمگیر آفریدی اپنے کالم روداد چمن میں لکھتے ہیں:

شاعر مشرق علامہ اقبال نے آج سے سو سال پہلے مسلمانوں کو درپیش جن مسائل اور مشکلات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لا الٰہ الا اللّٰہ

اب جب حالات یکسر تبدیل ہو چکے ہیں اور ہم ایک آزاد اور خود مختار ملک میں رہ رہے ہیں اس کے باوجود یوں محسوس ہو رہا ہے کہ علامہ اقبال نے یہ شعر ہماری موجودہ حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے کہا تھا۔ کافر اور غیر مسلم بستیوں کا تو کیا کہنا، آج مسلمان معاشروں میں بت پرستی کچھ ایسی عام ہو گئی ہے کہ اس پورے جہاں پر ایک بڑے بت کدے کا گماں ہونے لگتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے زمانوں میں پتھر کے بت ہوا کرتے تھے جبکہ اب یہ بت ہمارے اردگرد باطل نظریات، نفس پرستی، خود غرضی، شہرت، اقتدار اور دولت کی ہوس کی شکل میں موجود ہیں۔ یہ بت اتنی بڑی تعداد اور شکلوں میں ہیں کہ ان کے بت ہونے کا احساس ہی ختم ہو کر رہ گیا ہے۔ علامہ اقبال نے ان ہی بتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ

یہ مال و دولت دنیا، رشتہ و پیوند
بتان وہم وگماں لا الٰہ الا اللّٰہ

دراصل جس چیز کی محبت بھی آدمی کے دل پر اتنی غالب آ جائے کہ وہ اسے خدا کی محبت پر قربان نہ کر سکتا ہو، بس وہی اس کا بت ہے۔ ہماری ساری عمر ان بتوں کو سینوں سے لگائے گزر جاتی ہے اور ہم پھر بھی سمجھتے ہیں کہ ہم توحید کے علمبردار ہیں۔ اگر کسی دل میں شہرت، اقتدار یا مال وجاہ کی ہوس کے بت نہ بھی ہوں تو کچھ دیگر خواہشات مثلاً نفس پرستی، لالچ اور خود غرضی کے بت تو لازماً اس کی آستینوں میں موجود ہوں گے۔ شاید ایسے ہی بتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبال نے کہا تھا،

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکم اذاں لا الٰہ الا اللّٰہ

ان بتوں کو کسی اور نے نہیں بلکہ ہم خود ہی اپنا خون جگر دے کر اور اپنی آنکھوں پر حرص اور لالچ کی پٹیاں باندھ کر پروان چڑھایا ہے۔

بت شکن اٹھ گئے باقی جو رہے بت گر ہیں
تھا براہیم پدر اور پسر آزر ہیں

ہمارے اخلاقی نظام کا جنازہ اٹھ چکا ہے۔ ہماری سفاکی اور بے حسی کا یہ عالم ہے کہ دہشت گردی کے کسی ایک واقعے میں اگر سینکڑوں قیمتی جانیں بھی چلی جائیں تو ہمارے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں اور نہ ہی ہماری دعوتیں اور تقریبات متاثر ہوتی ہیں۔ معاشرے میں جرائم اور لاقانونیت کا کلچر جس تیزی سے پھیل رہا ہے اس سے نہ صرف مجرمانہ ذہنیت کو فروغ مل رہا ہے بلکہ اس کے نتیجے میں ریاستی رٹ پر بھی سوالات اٹھ رہے ہیں۔ ہماری فلمیں، ٹی وی اور تھیٹر انٹرٹینمنٹ کے نام پر آج جو کچھ پیش کر رہے ہیں اس کو سن اور دیکھ کر یہود اور ہنود بھی شرماتے ہوں گے۔ ہم اپنے اسلاف کا راستہ چھوڑ کر جس ڈگر پر چل پڑے ہیں وہ ذلت و رسوائی اور تباہی و بربادی کا راستہ ہے۔ امت مسلمہ کی اسی بدحالی کا مرثیہ پڑھتے ہوئے اقبال نے کہا تھا،

شور ہے ہوگئے دنیا سے مسلمان نابود
ہم یہ کہتے ہیں کہ تھے بھی کہیں مسلم موجود

وہ مزید کہتے ہیں کہ

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں، جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود

(روزنامہ آج پشاور 16 نومبر 2015ء)

پاکستان سیکولر کیوں بنے گا

معروف صحافی سلیم صافی اپنے کالم جرگہ میں رقمطراز ہیں۔

ظفر جمال بلوچ کا شمار اسلامی جمعیت طلبہ کے سنجیدہ اور انتہائی پڑھے لکھے ناظمین اعلیٰ میں ہوتا ہے انہوں نے اپنے بچپن کے ایک دوست خالد کو جو خطوط لکھے تھے وہ 'خالد کے نام' سے کتابچے کی صورت میں شائع ہوئے۔ کتاب میں صفحہ 19 پر ظفر جمال بلوچ لکھتے ہیں:

''ایک مشہور عالم دین مولانا عنایت اللہ گجراتی نے ایک نوجوان کو نصیحت کی کہ بیٹا جب تمہیں اللہ نے صحت دی ہے، جوانی دی ہے، سوچنے کو ذہن، بولنے کو زبان، چلنے کو ٹانگیں اور کام کرنے کو ہاتھ دیئے ہیں تو پھر تم اس کا شکریہ کیوں ادا نہیں کرتے؟ کیونکہ جہاں خدا یہ چیزیں دینے کی قدرت رکھتا ہے، وہیں لینے کی بھی قدرت رکھتا ہے۔ نوجوان کو بات سمجھ آ گئی اور اس نے نماز پڑھنی شروع کر دی۔ کچھ عرصہ کے لئے مولانا باہر پروگراموں میں شرکت کے لئے چلے گئے، واپس آئے تو دیکھا کہ نوجوان دوبارہ فلموں کا رسیا بن چکا ہے۔ بلایا اور کہا کہ میں نے تو تمہیں مسجد کا راستہ دکھایا تھا، سینما کا راستہ کس نے دکھایا تو اس نوجوان نے جواب دیا کہ مولانا جو سکون مجھے سینما میں محسوس ہوتا ہے، مسجد میں محسوس نہ ہوا۔

آپ کے کہنے پر مسجد کا رخ کیا، نماز پڑھ کر باہر نکلا تو کچھ لوگوں نے کہا کہ کن بدعتیوں کی مسجد میں نماز پڑھ لی، دوسری مسجد میں جاؤ، وہاں سے نماز پڑھ کر باہر نکلا تو تبصرہ ہوا کہ ان لوگوں کا تو عقیدہ ہی درست نہیں، یہاں نماز پڑھو گے تو سابقہ ادا کی جانے والی نمازیں بھی فاسد ہو جائیں گی۔ تیسری مسجد میں گیا تبصروں نے پھر جان نہ چھوڑی۔ پریشانی کی حالت میں نماز ترک کی اور ایک دن سینما کا رخ کیا، ٹکٹ لے کر اندر پہنچا تو سکون ہوا کہ ایک ہی قطار میں دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث اور شیعہ بیٹھے ہیں لیکن کیا مجال جو کسی کو کسی پر اعتراض ہو۔''

(روزنامہ جنگ لاہور 5۔اپریل 2016ء)

✿✿✿✿✿✿✿

مکرم بشیر رفیق صاحب کی یاد میں

جو کارِ خیر زمانے میں کر کے جاتے ہیں
وہ چل بسیں بھی تو ہر وقت یاد آتے ہیں

زمانہ رکھتا ہے ان ہی کے نام کو روشن
جو حسن خلق کی شمعیں جلا کے جاتے ہیں

وہ چھوڑ جاتے ہیں روشن حسین نقش قدم
اور عزم تازہ کے زندہ دیئے جلاتے ہیں

جو وقف زندگی کرتے ہیں خود خدا کے لئے
خدا کے ہو کے وہ دل کی مرادیں پاتے ہیں

دعائیں جن کا سدا اوڑھنا بچھونا ہوں
یہ ورثہ نسلوں کی خاطر وہ چھوڑ جاتے ہیں

دعا ہے ان کو ملے تیرے قرب کی جنت
کہ جس کی آس میں وہ زندگی لٹاتے ہیں

ا۔ب ناصر

مکرم خواجہ ایاز احمد صاحب

رئیس المفسرین، امام اللغۃ والأدب

حضرت امام راغب رحؒ اصفہانی

حضرت امام راغبؒ کا نام حسین بن محمد بن مفضل اور کنیت ابو قاسم ہے جبکہ لازوال شہرت امام راغب اصفہانی کے نام سے حاصل کی۔ بعض تذکرہ نویس آپ کے والد اور دادا کے نام کی ترتیب میں اختلاف کرتے ہیں مگر آپ نے خود اپنی شہرہ آفاق کتاب ''المفردات فی غریب القرآن'' کے مقدمہ میں اپنا یہی مذکورہ بالا نام لکھا ہے۔

آپ نے اپنی زندگی کے آخری سالوں اور وفات کے بعد عظیم الشان شہرت پائی جو آپ کی ہمہ گیر اور کثیر المنافع کتب کی وجہ سے حاصل ہوئی۔ یہ کتب آپ کی تبحر علمی، وسعت نظر، تعصب سے مبرا عالی حوصلگی اور تمام اسلامی و علمی موضوعات سے گہری واقفیت پر دلالت کرتی ہیں۔ اس کے باوجود آپ کی ولادت، مقام ولادت اور ابتدائی تعلیم و تربیت کے متعلق کوئی معین بات کتب تاریخ وسوانح میں نہیں ملتی۔ بلکہ حد تو یہ ہے کہ کتب طبقات میں آپ کا ذکر تک نہیں ملتا۔ اس کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ چونکہ آپ نے حاکموں کے دربار اور درباریوں سے اپنا تعلق نہ رکھا اس لئے آپ کے حالات مشہور اور محفوظ نہ ہوئے۔ صرف المنجد فی الاعلام میں زیرعنوان ''الراغب الاصفہانی'' لکھا ہے۔ ''اصل میں اصفہان سے تعلق رکھتے ہیں اور اقامت بغداد میں اختیار کی۔''

آپ کی نسبت اصفہان شہر کی طرف ہے جو علماء کا مرکز تھا اور بہت سے ائمہ حدیث و تاریخ اور ہرفن کے بڑے قابل قدر علماء اس علاقہ میں پیدا ہوئے یہاں سکونت اختیار کی اس لئے قیاس ہے کہ آپ نے اسی شہر اصفہان میں تعلیم و تربیت پائی ہوگی۔ آپ کے متعلق یہ تو ذکر ملتا ہے کہ آپ نے کثیر تعداد میں مختلف علوم و موضوعات پر کتب تصنیف فرمائیں لیکن بدقسمتی سے ہم تک ان میں سے مندرجہ ذیل صرف چار کتب طبع ہو کر پہنچی ہیں۔

(1) المفردات فی غریب القرآن

(2) الذریعة الی مکارم الشریعة (تصوف)

(3) تفصیل النشأتین و تحصیل السعادتین (اخلاقیات)

(4) محاضرات الادباء ومحاولات الشعراء و البلغاء (عربی ادب)

اس کے علاوہ ایک تفسیر القرآن ''تحقیق البیان فی تاویل القرآن'' کے نام سے لکھنی شروع کی (بعض نے اس کا نام ''جامع التفاسیر'' لکھا ہے) جس کے متعلق ذکر ملتا ہے کہ آپ اسے مکمل نہ کر سکے۔

علامہ عبداللہ بن عمر البیضاوی (متوفی 658ھ) نے اس کا اکثر حصہ اپنی تفسیر ''انوار التنزیل و أسرار التاویل'' میں شامل کر لیا۔ ویسے یہ کتاب بھی آپ کی بہت سی دیگر کتب کی طرح مفقود ہے۔ (علامہ بیضاوی بھی اصفہان کے قریب البیضاء مقام پر پیدا ہوئے۔) اس تفسیر کا مقدمہ محفوظ ہے جو 23 فصول پر مشتمل درمیانی تقطیع کے 33 صفحات کا ہے اور دیگر اداروں کے علاوہ اصح المطابع آرام باغ۔ کراچی نے بھی اسے زیور طباعت سے 1961ء میں آراستہ کیا۔ یہ مقدمہ اگرچہ مختصر ہے مگر آپ کی دیگر کتب کی مانند نہایت اعلیٰ منافع پر مشتمل ہے۔

آپ اہل سنت کے عظیم علماء میں سے اور شافعی المسلک تھے۔ (کنوز الاجدار از محمد کرد علی ص 268) لیکن تنگ نظر اور متعصب ہرگز نہ تھے۔ کسی مسئلہ پر مختلف علماء کے اقوال بیان کر کے ان پر بحث کرتے ہیں اور پھر ان میں صحیح قول کو قبول کرتے ہیں۔ آپ کی ایک عظیم صفت یہ ہے کہ ''منقول'' کو ہمیشہ ''معقول'' کے ساتھ ساتھ رکھتے ہیں۔ اس وجہ سے بعض علماء آپ کو ''معتزلی'' سمجھ بیٹھے۔

اس طرح ایک عاشق رسولؐ ہونے کے ناطے آپ اہل بیت سے بڑی محبت رکھتے ہیں اور اپنی کتب میں اس کا اظہار بھی کرتے ہیں جس کی وجہ سے بعض لوگ ان کو شیعہ بھی قرار دیتے رہے ہیں۔

آپ ایک عظیم مفسر ہونے کے ساتھ ساتھ حدیث، کلام، اخلاق، حکمت (فلسفہ)، شعر، لغتِ عرب، کتابت اور سابقہ علماء کے علوم سے گہری واقفیت رکھنے والے تھے۔ آپ کی کتب نے عوام وخواص میں بڑی قدر پائی۔ حتیٰ کہ امام غزالیؒ جیسا عظیم شخص آپ کی تصوف پر مبنی کتاب ''الذریعة الی مکارم الشریعة'' ہمیشہ اپنے پاس رکھا کرتے تھے۔

(روضات الجنات جلد نمبر 3 ص 197)

علامہ کرد علی آپ کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آپ اس پہلو سے ایک امتیازی شان رکھتے ہیں کہ عقل آپ کی تحریروں سے خوب چمکتے ہوئے جھلکتی ہے اور آپ تمام علماء پر اس لحاظ سے فوقیت رکھتے ہیں کہ آیات قرآنیہ سے نہایت عمدہ استنباط کرتے ہیں اور پھر اس ماحصل کو عین موقعہ پر ایسی عمدگی سے دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں کہ آپ کے بیان کو ثابت کر دیتی ہے۔ آپ حکمت یعنی علم عقل کو شرعی احکام کے ساتھ مطابقت دینے اور اپنی کتب کو فصاحت و بلاغت کے ساتھ ساتھ نہایت سہل اور نفع مند طور پر ترتیب دینے میں اپنا نظیر نہیں رکھتے۔'' (کنوز الاجداد ص 269)

پھر وہ آپ کی کتب کا خوبصورت جامع تعارف کراتے لکھتے ہیں:

''کیا وحی قرآن کے اسرار سے واقفیت حاصل کرنے کی خواہش رکھنے والا آپ کی کتاب ''المفردات فی غریب القرآن'' سے مستغنی ہوسکتا ہے؟ کیا وہ شخص جو شریعت کے احکام اور مکارم سے یکجائی طور پر علمی و عملی لحاظ سے آگاہ ہونا چاہے وہ آپ کی کتاب ''الذریعة الی مکارم الشریعة'' سے استفادہ کئے بغیر رہ سکتا ہے؟ کیا جس شخص نے آپ کی کتاب ''محاضرات الادباء'' کا بار بار گہرا مطالعہ نہیں کیا اس کا ادب عربی کا علم مکمل ہوسکتا ہے؟ اور کیا اخلاقیات کا طالب علم آپ کی کتاب ''تفصیل النشأتین'' کے مطالعہ کے بغیر کچھ پا سکتا ہے۔''

(حوالہ مذکور)

''حضرت علامہ راغبؒ اپنی کتاب ''المفردات فی غریب القرآن'' کے مقدمہ میں کتاب کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں: علوم قرآن کو حاصل کرنے کے لئے جس چیز کی سب سے پہلے ضرورت پڑتی ہے وہ قرآن کے الفاظ و مفردات کا علم ہے۔ اور قرآنی مفردات کے معانی کی تحصیل ویسی ہی پہلی اور بنیادی ضروری چیز ہے جیسے ایک عمارت بنوانے والے کے لئے سب سے پہلے اینٹوں کا حصول لازمی ہے۔ قرآن مجید نے لغت عرب کے ذخیرہ میں سے جو الفاظ استعمال کئے ہیں وہ لغت عرب کا بہترین نچوڑ ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا سب سے اعلیٰ جز و اور مغز ہیں۔ اور بقیہ وہ عربی الفاظ جو قرآن میں استعمال نہیں ہوئے وہ مستعمل الفاظ کے لئے خادم اور تفصیل کا حکم رکھتے ہیں یا جیسے ایک نہایت خوشنما اور خوش ذائقہ پھل کے اوپر چھلکا ہو یا اس کے اندر بیج ہوں۔

(مقدمہ مفردات راغب ص 2)

پھر آپ لکھتے ہیں:

''اس کتاب (مفردات) کی تکمیل کے بعد اگر اللہ نے چاہا اور میری عمر نے مہلت دی تو ایک ایسی کتاب تیار کروں گا جو مترادفات قرآن (قرآن مجید کے ہم معنی الفاظ) کی تحقیق پر مبنی ہو گی۔ اس میں میں ان بظاہر ہم معنی الفاظ میں فرق بیان کروں گا۔'' (حوالہ مذکور)

(اللہ بہتر جانتا ہے کہ آپ نے یہ کتاب تصنیف فرمائی یا نہیں لیکن ہم تک اس کا تذکرہ بھی نہیں پہنچا)

آپ کی کتاب تفصیل النشأتین و تحصیل السعادتین 33 ابواب پر مشتمل ہے اور اسے چھوٹی تقطیع کے ایک سو پانچ صفحات پر ناشر مصطفیٰ آفندی نے مصر سے شائع کیا۔ پہلے باب کا عنوان ''معرفة الانسان نفسه'' ہے اور آخری باب کا عنوان ''فضيلة الانسان اذا شرف علی الملائکة'' ہے۔

آپ کی کتاب ''محاضرات الادباء'' دو اجزاء میں 25 ابواب پر مشتمل ہے اور بڑی تقطیع کے 675 صفحات پر مشتمل ہے۔ پہلے باب کا عنوان ''فی العقل و الجهل و مایتعلّق بها'' ہے اور آخری باب ''فی فنون مختلفة'' کے عنوان سے ہے۔ یہ کتاب المطبعة العامرة الشرفية۔ مصر نے 1326ھ میں شائع کی تھی۔ آپ کی ان تمام کتب کی ایک مشترک عظمت یہ ہے کہ ان تمام کا آغاز الحمدللہ کے الفاظ سے ہوتا ہے۔

خلفائے احمدیت کا خراج تحسین

آپ کی کتاب مفردات نے ائمہ جماعت احمدیہ سے خوب دادِ تحسین پائی ہے۔

حضرت خلیفۃ المسیح الاول فرماتے ہیں:

''مفردات راغب عربی کی مستند لغت قرآن (ہے)۔''

حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے تفسیر میں جابجا مفردات راغب سے حل لغت کے حوالے دے کر اللہ تعالیٰ کے ارشادات کی توضیح فرمائی ہے اور آپ کی لطافت بیان اور فہم قرآن کی بڑی تعریف فرمائی ہے۔ مثلاً ''وحی'' کے عربی لغت میں متعدد معانی ہیں۔ قرآن مجید میں ان میں سے کون کون سے معانی مراد ہیں، اس سلسلہ میں آپ نے آیت ومن اظلم ممن افتری (الانعام: 94) سے نہایت عمدہ استنباط فرمایا ہے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی آپ کی اس بحث کو درج کر کے فرماتے ہیں:

''یہ ایک نہایت ہی لطیف بات ہے جو مفردات والوں نے بیان کی ہے۔''

(جلد 9 ص 433)

اس طرح حضرت خلیفۃ المسیح الرابع نے بالخصوص اپنے درس قرآن رمضان المبارک میں قرآنی الفاظ کی لغت کے لئے مفردات پر بہت اعتماد فرمایا اور متعدد مرتبہ آپ کا ذکر بڑی مدح کے ساتھ فرمایا مثلاً ایک موقعہ پر فرمایا:

''حضرت امام راغبؒ کی کتاب ''مفردات راغب'' ہے۔ جو سند ہیں اس پہلو سے کہ ان سے بہتر لفظوں کی کُنہ تک پہنچنے والا کوئی اور مفسر میں نے نہیں دیکھا۔''

(درس القرآن 2 رمضان 21 دسمبر 1999ء)

ایک موقعہ پر فرمایا:۔

''حضرت امام راغبؒ بہرحال قرآن فہمی کے لحاظ سے اور عربی الفاظ کے فہم کے لحاظ سے سب پر بالا ہیں۔ ماشاءاللہ۔''

(درس القرآن یکم رمضان 22 جنوری 1996ء)

ایک اور موقع پر نہایت شاندار خراج تحسین پیش کرتے ہوئے فرمایا:

''حضرت امام راغبؒ کا دماغ اتنا روشن اور پاکیزہ ہے کہ شاذ کے طور پر انہوں نے کبھی کوئی غلطی کی ہوگی۔ ورنہ قرآن کریم کے الفاظ کے بیان میں انتہائی احتیاط سے کام لیتے ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ قرآنی الفاظ کے قرآنی آیات کے ذریعہ معانی کرتے ہیں۔ کسی لغت کی اور ضرورت نہیں۔ پس قرآنی لغت کیا ہے؟ یہ سیکھنا ہو تو حضرت امام راغبؒ سے سیکھیں۔ ہر لفظ کے قرآنی آیات کے سہارے معنی کرتے ہیں اس میں غلطی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

(درس القرآن 2 رمضان یکم جنوری 1998ء)

قرآن مجید کا یہ خادم عظیم الشان خدمات سرانجام دینے کے بعد 502ھ بمطابق 1108ء میں اس دار فانی سے کوچ کر گیا۔ آپ کے مقام ولادت کی طرح آپ کے مقام وفات کا ذکر بھی نہیں ملتا۔